۳

بلادِ مغرب میں مسلم شناخت کا مسئلہ

گزشتہ دنوں مجھے Sandi Tom کا ایک نغمہ 'I wish I was a Punk Rocker with flowers in my hair' سُننے کا اتفاق ہوا۔ ایک ایسی دنیا کا تصوّر جو اب صرف ہماری یادوں کا حصّہ ہے اور شاید جس کی اب از سرِ نو تعمیر ممکن نہیں۔ ایک ایسی دنیا جب موسیقی کی معنویت باقی تھی، جب ریڈیو کا راج تھا، جب اکاؤنٹنٹ ہماری زندگیوں کو کنٹرول نہیں کرتے تھے۔ جب ذرائع ابلاغ کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ وہ ہماری روح کا سودا کر سکے، جب پاپ اسٹار کا ظہور نہیں ہوا تھا، جب کم علمی ایک طرح کی رحمت تھی، ہائے وہ کیا زمانہ تھا جب لوگوں سے رابطے کا واحد ذریعہ خط و کتابت ہوا کرتا تھا اور جب اطلاعات کی نئی شاہراہ دور فضا میں کہیں بھٹکا کرتی تھی۔ افسوس کہ گلوبلائزیشن نے زندگی کا حسن، اس کی سرّیت اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی خودساختگی چھین لی ہے۔ ایک دم توڑتی رومانی دنیا کا نوحہ سُن کر مجھے ایسا لگا جیسے نغمے کی پُر تاثیر زبان سے دل کا مضراب بج اُٹھا ہو، حالاں کہ ہم اہلِ مشرق اور بالخصوص مسلمانوں کی ذہنی تربیت کچھ اس طرح ہوتی ہے کہ وہ مغرب کے کرب اور ان کے مسائل کو اپنا مسئلہ تسلیم کرنے سے انکاری ہوتے ہیں، لیکن مصیبت یہ ہے کہ گلوبلائزیشن کے محسوس اور نامحسوس عمل نے انسانی زندگی کو کچھ اس طرح اپنے شکنجے میں کس دیا ہے کہ اب دنیا داروں کی دنیا سے الگ کسی اور دنیا کا تصوّر عملی طور پر باقی نہیں رہ گیا ہے۔ مشرق کے روحانی نفوس ہوں یا مغرب کی مادّہ زدہ قومیں، خدا کے تابعدار ہوں یا اس کے باغی، یہ سب کے سب ایک ہی دنیا پر سوار ہیں۔ پھر یہ کیوں کر ممکن ہے کہ وہ دنیا کی سمت اور اس کی قسمت کے فیصلے کے سلسلے میں کمال سردمہری کا مظاہرہ کریں۔

اب تک مسلمان عوامی سیکولر کلچر کے بارے میں محض تحفّظات کا اظہار کرتے آئے ہیں۔ بلکہ سچ پوچھیے تو ہم نے عام انسانوں کی دنیا سے الگ اپنی قلعہ بند دنیا بنانے کی کوشش کی ہے۔ مسلم دانشوروں کا رویّہ یہ رہا ہے کہ وہ مغرب کی عوامی زندگی کے مقابلے میں مناسب متبادل کی فراہمی کا کام انجام دیں۔ لہٰذا عوامی موسیقی اور نغمہ کے مقابلے میں اسلامی میوزک کا ڈول ڈالا گیا جو قدیم صوفیانہ میوزک سے الگ جدید لب و لہجے میں ایک نئے مسلم پاپ کلچر کی تشکیل کی کوشش تھی۔ جہاں سچ پوچھیے تو نہ اسلام تھا اور نہ ہی میوزک۔ اسلامی میوزک اسلامک اکنامکس اور اسلامک سائنس جیسی اصطلاحوں نے پوسٹ ماڈرن معاشرے میں ایک مصنوعی قلعہ تعمیر کرنے کا احساس تو ضرور دلایا' البتہ اس پورے عمل میں مسلمان اصل دنیا سے کٹ کر رہ گئے' جہاں زندگی کا ریلا اور تاریخ کا بہاؤ ہماری دنیا کو ہماری خواہشات کے برعکس مسلسل مخالف سمت میں لے جا رہا تھا۔ جوں جوں دنیا کا سکڑنا ہم پر واضح ہوتا جا رہا ہے اور جیسے جیسے گلوبلائزیشن کا شکنجہ سخت ہوتا جاتا ہے ہمیں صاف محسوس ہو رہا ہے کہ ہمارا تعمیر کردہ مصنوعی اور نفسیاتی حصار اب زمیں بوس ہونے کو ہے، اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس وقت مسلمان اہلِ فکر جہاں کہیں بھی آباد ہیں وہ اس نئی صورت حال پر نئے انداز سے سوچنے کی ضرورت شدّت سے محسوس کر رہے ہیں۔

مغرب کے ان معاشروں میں جہاں مسلمان اجنبی معاشروں سے تعامل پر مجبور ہیں ان سوالات کی دھار اور بھی تیز ہوگئی ہے آیا مسلمان مغرب کے اجنبی معاشرے میں پوری طرح ضم ہو جائیں جیسا کہ یورپ اور امریکہ میں بسا اوقات ہوا بھی ہے اور جس کی بنا پر امریکی عمرانی ماہرین فخریہ انداز سے اپنے معاشرے کو اقوام عالم کے لیے melting-pot کہتے رہے ہیں یا اس کے برعکس، وہ اپنے ثقافتی اور مذہبی ورثے کو بچائے رکھنے کے لیے مغرب کے اجنبی معاشرے سے کم سے کم تعامل کی ریت پر قائم رہیں۔ اسلامی مراکز، کثیر مقاصد مساجد اور مسلم اسکولوں کے قیام کے پیچھے بنیادی طور پر یہی جذبہ کارفرما رہا ہے۔ ان دو نقاطِ نظر کے مابین اب ایک تیسرا نقطۂ نظر' جس کی وکالت بعض پُرجوش نوجوان اہلِ فکر کر رہے ہیں' یہ ہے کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ نہ صرف یہ کہ مغرب کے معاشرے میں خود کو ضم (integrate) کریں بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ایک ذمّہ دار شہری کے طور پر معاشرے میں سرگرم رول (proactive) انجام دیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان اب تک مغربی کے معاشرے میں حاشیے پر رہے ہیں۔ انھوں نے اپنے آپ کو عمومی مسائل سے غیر مربوط رکھا ہے اس لیے معاشرے میں ان کا وزن محسوس نہیں کیا جاتا۔ اگر وہ ایک مکمل شہری کے طور پر بھرپور رول کے لیے خود کو تیار کر سکیں تو نہ صرف یہ کہ ان کے سیاسی اور سماجی وقار میں اضافہ ہوگا بلکہ مغربی ممالک بھی اپنے ان شہریوں کی صلاحیتوں اور ان کی اخلاقی قدر و قیمت سے پوری طرح مستفید ہو سکیں گے۔ اس خیال کے حاملین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مغرب کی مخصوص ثقافت اور مغربی زندگی کے مختلف مطالبات کے سبب یہ بات بالکل فطری ہے کہ مغرب کے مسلمان عالم اسلام کے مسلمانوں سے قدرے مختلف دکھائی دیں اور یہ کہ وہ اپنے مخصوص لب و لہجے اور حالات کے سبب ایک نئی شناخت کے حامل ہوں۔

ایک نئے مغربی مسلمان کی شناخت اور مغربی اسلام کے قالب کی خواہش نے مسلمانوں کی نئی آبادیوں کو ایک سخت نظری تشنج سے دوچار کر رکھا ہے۔ ایسا اس لیے بھی کہ مسلم اہلِ فکر یہ محسوس کرتے ہیں کہ مغرب کی ان حکومتوں کا قومی مفاد بسا اوقات عالمِ اسلام سے متصادم ہوتا ہے۔ خلیج کی پچھلی جنگوں، اور بالخصوص ۹/۱۱ کے بعد عالمِ اسلام میں امریکی اور مغربی مداخلت نے اس خیال کو مزید سند بخشا ہے کہ مغربی پالیسی من حیث الامۃ مسلمانوں سے راست متصادم ہے۔ پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ مسلمان ان حکومتوں کی فلاح و بہبود کے عمل میں خوش دلی سے شامل ہوں۔ جب حالات کی سنگینی بعض امریکی سفارت کاروں، فوجیوں اور پالیسی سازوں کو اس بات پر مجبور کرتی ہو کہ وہ اپنے ضمیر کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنی ملکی پالیسی سے بغاوت کریں، جب مغرب کے لاکھوں باضمیر انسان جنگ کے خلاف آواز بلند کرنے پر خود کو مجبور پاتے ہوں تو بھلا مسلمانوں کے لیے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ جو حق و انصاف کے امین ہیں، مغربی حکومتوں کی صرف اس لیے ہمنوائی کریں کہ انھوں نے ان ملکوں کی شہریت اختیار کر رکھی ہے۔ پھر یہ بات بھی اپنی جگہ درست ہے کہ جہاں غیر اقوام کے احتجاج کو جمہوری عمل کا حصّہ سمجھا جاتا ہے وہاں مسلمانوں کی طرف سے بلند ہونے والی صدائے احتجاج بالعموم اس طرح دیکھی جاتی ہے گویا یہ ایسے لوگوں کا شور شرابہ ہو جو مغربی معاشرے میں برسہا برس رہنے کے باوجود اس سے ہم آہنگ نہیں ہو پائے ہیں۔

ہمیں یہ بات ایک لمحے کے لیے بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ محمد رسول اللہ کی حیثیت تمام اقوامِ عالم کے لیے بشیر و نذیر کی ہے۔ قرآن کے الفاظ میں آپؐ رحمۃ للعالمین ہیں۔ عام طور پر اسلام کی جو تصویر مغرب میں پیش ہوتی رہی ہے وہ ایک ایسے دین کی ہے جو محض عالمِ مشرق کی تہذیبی میراث ہو۔ محمد رسول اللہ کو نبی عربی یا عالمِ عرب کا پیغمبر یا (Prophet of the Desert) سمجھا جانا بہت کچھ معمول کی بات سمجھی جاتی ہے۔ پھر یہ خیال بھی عام ہے کہ قرآن مجید مسلمانوں کی مذہبی کتاب ہے جس طرح عیسائیوں کے لیے بائبل اور یہودیوں کے لیے توراۃ۔ یہ تمام باتیں خواہ حقائق کا معتبر ترین اظہار کیوں نہ سمجھی جائیں واقعہ یہ ہے کہ ان بیانات سے اسلام اور محمد رسول اللہ کے واقعی مقام کا صحیح تعیّن نہیں ہوتا۔ اس کی ایک وجہ تو غالباً ترجمہ کے پیدا کردہ بعض مسائل ہیں، جس نے اسلام کی صحیح تعریف کو غیر عرب اقوام تک پہنچنے سے روکے رکھا ہے۔ گو کہ مشرق میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو اسلام کو ایک تہذیبی شناخت کے بجائے عبودیت پر مبنی ایک رویّہ سمجھتے رہے ہیں کہ ہمارے یہاں اس قبیل کی روایتیں زبان زدِ عام رہی ہیں کہ الاسلام لیس بتمنیٰ فقط و لکن ماوقر فی القلب و صدق له العمل البتہ مغرب میں اسلام کی اس تعریف کو متعارف کرانے کا سہرا ایک عیسائی مستشرق W.C. Smith کے سر جاتا ہے جنھوں نے برملا اس بات کا اظہار کیا کہ وہ عیسائی روایت میں خدا کے ایک فرماں بردار بندے ہیں اس لیے عربی زبان میں ان کے لیے لسٹ بمسلم کہنا امر محال ہے۔ کہ عربی میں مسلم کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کہنے والا یہ اقرار کرتا ہے کہ وہ فرماں برداروں میں سے ہے البتہ جب

انگریزی میں کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ وہ مسلمان ہے تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کا تعلق قومِ مسلم سے ہے۔ ترجمے کا پردہ اگر چاک کر دیا جائے تو غیر عرب اقوام کے لیے یہ سمجھنا آسان ہو جائے گا کہ قرآن مجید صرف قومِ مسلم کی کتاب نہیں بلکہ خدا کے ان تمام اطاعت گزاروں کا مشترکہ سرمایہ ہے خواہ ان کا تعلق کسی بھی مذہبی، تہذیبی، لسانی یا جغرافیائی سلسلے سے پایا جاتا ہو۔ اور یہی منطقی جواز ہے محمد رسول اللہ کے رحمتِ عالم ہونے کا۔ لیکن افسوس کہ مسلمان علما و دانشور اسلام کے اس آفاقی لب و لہجہ کو متعارف کرانے میں ناکام رہے ہیں۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا اسلام کی دعوت کسی زمانی، قومی اور تہذیبی تشخص سے ماوراء ہے ہاں یہ سچ ہے کہ آپؐ کی بعثت ایک عرب معاشرے میں ہوئی اور ایک آفاقی معاشرے کی تعمیر کا تجربہ عرب معاشرے سے شروع ہوا البتہ ابتدائی دنوں میں ہی قرآن نے اس بات کی وضاحت کر دی کہ بعثت محمدی کا مقصد کسی تہذیبی اکائی کا احیاء یا کسی نئی مذہبی شناخت کا قیام نہیں بلکہ آپؐ کا کام اس دینِ ابراہیمی کا احیاء ہے جس سے وابستہ مختلف مذہبی طائفے اپنے بارے میں مختلف قسم کی خوش گمانیوں میں مبتلا ہیں۔ اور جو یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ محض کسی نبوی سلسلے سے وابستگی ان کے لیے وجہ نجات بن سکتی ہے۔ قرآن نے ان تصوّرات کا قلع قمع کیا کہ محض یہودی عیسائی یا محمدی سلسلوں سے وابستگی کسی کے لیے وجہ نجات بن سکتی ہے۔ اس کے برعکس ایمان اور عمل صالح کا امتزاج کسی بھی شخص کو خواہ اس کا تعلق ان مذکورہ خیموں سے ہو یا نہ ہو ﴿لا خوف علیهم ولا هم یحزنون﴾ کی بشارت دے سکتا ہے۔ ہمارے ہاں ماضی میں ایمان کی پیمائش اور نجات کی بنیادی شرائط پر جو متکلمانہ بحثیں ہوئی ہیں اس نے قرآن کے ان منصفانہ اور آفاقی بیانات پر بڑی حد تک پردہ ڈال دیا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو اہلِ یہود پر قرآنی تنقید ﴿لن تمسّنا النار الا ایاماً معدودة﴾ بڑی حد تک مسلمانوں پر بھی صادق آتی ہے جنھوں نے بعض خوش گمان روایتوں کے زیر اثر محمد رسول اللہ کو یومِ آخر میں مسلم قوم کی داد رسائی کے لیے منصب شفاعت پر فائز کر رکھا ہے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ اسلام کی یہ قومی تصویر جو جمہور عوام میں مقبول عام ہے قرآن کے آفاقی لب و لہجہ سے میل نہیں کھاتی۔

ایک مسلمان کی حیثیت سے مجھے یہ کہنے میں قطعی تکلّف نہیں کہ ایک ایسے مخلوط معاشرے کا خواب جس میں تمام مذہبی اور تہذیبی طائفوں کی سعید روحوں کو یکساں خوش گواری کا احساس ہو اور جہاں تمام انسانوں کو خیر کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا یکساں موقع فراہم کیا جائے، ہماری مذہبی آرزوؤں کا امین ہے۔ اس نکتہ کو سمجھنے کے لیے لازم ہے کہ ہم اسوۂ رسولؐ کی روشنی میں ان قرآنی آیات کا از سرِ نو مطالعہ کریں جن پر فقہا کی قیل وقال اور تاریخ و روایات کی گرد نے حجابات حائل کر دیے ہیں۔

سب سے پہلی بات تو یہ سمجھ لینے کی ہے کہ محمد رسول اللہ کی دعوت تمام انبیاء کی دعوتوں کا ارتکاز ہے جہاں صرف نبوت محمدی

پر ایمان لانا کافی نہیں بلکہ تمام انبیائے سابقین اوران پر نازل ہونے والی وحی کو صدقِ دل سے قبول کرنا بھی ایمان کالازمہ ہے۔ سورۃ بقرۃ کی آیات ۱۳۵، ۱۳۶ جہاں یہود و نصاریٰ (روایتی مسلم) بننے کے بجائے تمام انبیاء پر ایمان لانے کی دعوت دی گئی ہے ہم سے یہ بھی مطالبہ کرتی ہے کہ ہم بلا امتیاز فضیلت ﴿لانفرق بين احدمنهم﴾ تمام انبیاء پر ایمان لائیں۔ سو اگر ہم نے ایسا کیا تو راہ یاب ہوئے ورنہ گمرہی ہمارا مقدر بن گئی ﴿فان آمنو بمثل ما آمنتم به فقداهتدوا﴾ (بقرۃ ۱۳۷)۔ متّبعین محمد کی حیثیت سے ہم پر یہ بھی لازم ہے کہ ہم قومی اور تہذیبی تشخص سے ماوراء اپنے لیے ایک ایسا آفاقی قالب تشکیل دیں جس پر تمام انبیائے سابقین اور ان کے متبعیّن کی مشترکہ شناخت کا رنگ پایا جاتا ہو جسے قرآن صبغۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے اور جسے کبھی لفظ مسلم کا ہم معنی سمجھا جاتا تھا۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ایک طویل تاریخی عمل میں مسلم ہونا ایک قومی شناخت بن کر رہ گیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے دوبارہ صبغۃ اللہ سے متصف کیا جائے۔

اسلام کے بارے میں ایک غلط فہمی جو مغرب میں اب بھی عام ہے وہ یہ ہے کہ بالعموم اسے انبیائی سلسلوں کے ارتکاز کے بجائے فرقۂ محمدی (Muhammad-centered religion) کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جب کہ قرآن مجید کا واضح مطالبہ ہے کہ لوگو! ربّانی بنو ﴿كونوا ربّانيين﴾ ان معنوں میں کہہ لیجیے کہ اسلام ایک God-centered دین ہے۔ حضرت مسیح کے بغیر عیسائیت کا تصوّر محال ہے لیکن محمد رسول اللہ کے بارے میں قرآن کا ارشاد ہے ﴿ومامحمد الارسول قد خلت من قبله الرسل أفإن مات أو قتل انقلبتم على أعقابكم﴾ تمام انبیاء ربّانی بنانے کے لیے آئے تھے۔ عیسائی، یہودی یا دیگر قومی شناختوں کے قیام کے لیے ان کی بعثت نہیں ہوئی تھی۔ انبیاء کسی نہ کسی تہذیبی، لسانی یا جغرافیائی سلسلے سے آتے ہیں۔ اس لیے ایک وسیع آفاقی معاشرے کا قیام تبھی ممکن ہے جب تمام انبیاء کو قبول کرتے ہوئے ربّانی شناخت کا ڈول ڈالا جائے۔ صبغۃ اللہ کی یہ دعوت ایک ایسے مخلوط ایمانی معاشرے کا تصوّر پیش کرتی ہے جہاں تمام انبیاء کے راہ یاب طائفے خیر کے کاموں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے ہوں۔ ایک ایسا رنگا رنگ معاشرہ جہاں عبودیت کے مختلف طریقے رائج ہوں نہ صرف یہ کہ خدائی اسکیم کا حصّہ ہے بلکہ قرآنی دائرۂ فکر میں اس بات کی پوری گنجائش موجود ہے کہ اس تہذیبی اور مذہبی بوقلمونی کو برقرار رکھا جائے۔ سورہ حج (آیت ۴۴) میں اس بات کا واضح اشارہ موجود ہے کہ اہلِ کتاب کی عبادت گاہیں (اور ان پر دوسرے ادیان کو قیاس کیجیے) خدا کے ذکر کثیر سے معمور ہیں۔

یہ ہے وہ مختصر ترین خاکہ اس آفاقی اسلام کا جس کی قیادت گو متّبعین محمد کے ہاتھوں میں ہے، کہ وہ آخری وحی کے امین ہیں،

البتہ اس نبوی پروجیکٹ میں تمام ہی انسانی گروہوں کو اپنی اپنی بساط اور توفیق بھر شریک ہونا ہے۔ ظاہر ہے اتنے بڑے کام کی تکمیل مسلمان اپنے خول میں بند ہو کر نہیں کر سکتے۔ لہٰذا جو لوگ مسلمانوں کو ایمان کی حفاظت کے لیے قلعہ بند ہونے کی ترغیب دے رہے ہیں وہ یقیناً اسلام کی اس آفاقی حیثیت سے آگاہ نہیں۔ ماضی میں جن فقہاء نے دنیا کو دارالاسلام اور دارالکفر کے دو مختلف بلاکوں میں تقسیم کرنے کی کوشش کی انھوں نے بھی اسلام کے اس آفاقی پیغام کا پاس نہیں رکھا۔ رہے وہ لوگ جو مغرب میں مسلمانوں کو محض ایک عام شہری کی حیثیت سے معاشرے میں بھرپور شرکت کی دعوت دے رہے ہیں اور جو یہ چاہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں اہلِ یہود کی طرح مغربی ملکوں میں مسلم وزراء اور پالیسی سازوں کی بھی ایک کھیپ پیدا ہو جائے وہ بھی اسلام کے بنیادی مشن سے ناواقف ہیں۔ مغرب کے مختلف ملکوں میں اگر مسلمان اپنی بھرپور شرکت کے ذریعے اعلیٰ ریاستی مناصب تک پہنچنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں حتیٰ کہ انھیں امریکہ اور یورپ کی حکومتوں کا کنٹرول بھی حاصل ہو جاتا ہے تو اسلام کا وہ مشن تشنۂ تکمیل ہی رہے گا جس کا مقصد بلا امتیاز رنگ و نسل تمام اقوام کی فلاح و نجات کا سامان کرنا ہے۔ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے ہمارے لیے ایک ایسی صورت حال قابلِ قبول نہیں ہو سکتی کہ ہم چور دروازوں سے اقوامِ عالم کی گردنوں پر اپنے سیاسی تسلّط کا خواب دیکھیں۔

اس مسئلہ پر ایک اور پہلو سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ مغرب ہو یا مشرق مسلمانوں کا اپنے تہذیبی حصار میں محبوس رہنا سمّ قاتل ہے۔ البتہ ایک بھرپور شرکت کی دعوت دینے سے پہلے لازم ہے کہ ہم بعض خوش فہمیوں کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیں۔ بھلا اس خیال کو ہم کیسے دفن کر سکتے ہیں کہ ہم جس نظامِ انصاف کے داعی ہیں اس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ ہمارا قومی مفاد دیگر اقوام کے قومی مفاد سے متصادم نہ ہو۔ مغرب ہی کیا مسلمانوں کے لیے تو یہ بھی ممکن نہیں کہ وہ اقوام مشرق کے مفادات کے تحفّظ کے لیے سامنے آئیں کہ ان کی نظر میں تمام اقوام عالم ایک خدائی کنبہ ہے جس کی اجتماعی فلاح و بہبود، نصح و خیر خواہی اور فلاح و نجات پر انھیں مامور کیا گیا ہے۔ اس پیمبرانہ منصب سے کنارہ کشی کے بغیر ہمارے لیے یہ ممکن نہیں کہ ہم نیشن اسٹیٹ کے مفادات کے لیے خود کو پیش کر سکیں۔ اس بارے میں بعض لوگ اہلِ یہود کی مثال دیتے ہیں کہ جب تک اہلِ یہود اپنے تہذیبی اور مذہبی حصار میں بند رہے ان کا مقام تاریخ کا حاشیہ رہا۔ لیکن جب انھوں نے اس نفسیاتی حصار کو توڑ ڈالا تو ان کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ وہ نہ صرف یہ کہ وہ اقوام عالم کا ہراول دستہ بن گئے بلکہ مغرب کے بعض ممالک میں انھیں فیصلہ کن حیثیت حاصل ہو گئی۔ اہلِ یہود کی حیرت انگیز کامیابی میں یقیناً ہمارے لیے بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ البتہ اس تجربے کا بہ نظر غائر تجزیہ کی ضرورت ہے۔ ہم اس خیال کی تو یقیناً تائید کرتے ہیں کہ علوم کی دینی اور دنیوی تقسیم کو ختم کرنے کی ضرورت ہے کہ اکتشافی علوم کے سلسلے میں ہمارا ذہنی تحفّظ قرآنی دائرہ فکر سے متصادم ہے۔ البتہ ہم اس خطرے کا احساس بھی دلا دینا چاہتے ہیں کہ مغرب کے

مکمل نظری شہری کے طور پر مسلمانوں کو متحرک کر دینا بالخصوص ایک ایسی صورت حال میں جب ان کے دل و دماغ پر پیمبرانہ مشن کے مطالبات کا فقدان ہو ہماری آنے والی نسلوں کی مکمل نظری تباہی کا سبب ہو سکتا ہے۔ Moses Mendelssohn جسے Reformed Judaism کا بانی مبانی سمجھا جاتا ہے جس نے اہلِ یہود کو اس بات کی دعوت دی کہ وہ اپنی قومی شناخت کو خیر باد کہتے ہوئے مقامی معاشروں کی شناخت اختیار کریں' خود اس کے اہلِ خانہ کے ساتھ جو صورت حال پیش آئی وہ بھی ہمارے لیے کم عبرت انگیز نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ منڈلسن کی دونوں بیٹیاں اس کی زندگی میں عیسائی ہوگئیں اور صاحبزادے نے اس کی موت کے بعد یہ کہتے ہوئے یہودیت کو خیر باد کہا کہ فی زمانہ چوں کہ عیسائیت ہی متمول لوگوں کا مذہب ہے اس لیے وہ اپنی پُرانی یہودی شناخت پر اصرار کے لیے کوئی معقول جواز نہیں پاتے۔ منڈلسن کی تحریک نے اہلِ یہود کے لیے یقیناً آنے والے دنوں میں بلا روک ٹوک مغرب میں اعلیٰ مناصب کے لیے راستے کھول دیے۔ اس میں شبہ نہیں کہ بعض مغربی ریاستوں کو یرغمال بنا لینے کے سبب اہلِ یہود آج اس لائق ہیں کہ وہ کسی حد تک اپنی دو ہزار سالہ جلاوطنی کا مداوا کر سکیں۔ لیکن ایک خالص نبوی پروجیکٹ جس طرح سیکولر اور مادہ پرست یہودیوں کے ذریعے ہائی جیک ہو گیا ہے اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ہمارے روشن خیال مفکّرین بھی یقیناً اس صورت حال کو قبول نہیں کر پائیں گے کہ چند مسلمانوں جیسے نام رکھنے والے لوگ مغرب میں کلیدی عہدوں پر فائز ہو جائیں اور اس کے بدلے اسلام اور اسلامی مشن پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فاتحہ پڑھ لیا جائے۔

ہمارے خیال میں مسئلہ کا حل نہ تو intergration میں ہے اور نہ ہی isolation میں' اور نہ ہی contribution اس ذہنی تشنج سے، جس میں مغربی مسلمان خود کو گھرا پاتے ہیں، انھیں نجات دلا سکتا ہے۔ جب تک اجنبی معاشرے میں بھرپور شرکت کے لیے نظری بنیادیں فراہم نہیں کی جاتیں اور جب تک مسلمانوں کو اس بات پر مطمئن نہیں کیا جاتا کہ مغرب کے ایک وفادار شہری کے طور پر ان کی سرگرمی اسلام کا مطلوب و مقصود ہے اس وقت تک 'contribution' کے داعیوں کو apologists کے طور پر ہی دیکھا جاتا رہے گا۔ ہمیں اس سوال کا شافی جواب فراہم کرنا ہوگا کہ اگر مسلمان مغرب کے معاشروں میں ایک مستند شہری کی حیثیت سے سرگرم رول ادا کرنے کو اپنا مطلوب و مقصود جانیں گے تو دیگر اقوام کے مقابلے میں ان کا وجہ امتیاز کیا ہوگا۔ محض یہ کہنا کہ مسلمان اپنی اعلیٰ اخلاقیات اور روحانی ورثے کے ساتھ مغرب کے معاشرے کو (enrich) مستفید کر سکیں گے نہ صرف یہ کہ معذرت خواہانہ طرزِ فکر ہے بلکہ اسلام کے عظیم مشن کو اخلاقیات میں محدود کرنے کے مماثل بھی ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان ان تینوں مروجہ رویّوں سے آگے بڑھ کر خود کو ایک نجات دہندہ گروہ کے طور پر متعارف کرائیں۔ ایسے زندہ دل اور بیدار مغز لوگوں کا گروہ جو مشرق میں ہوں یا مغرب میں' انھیں اپنی فکر سے کہیں زیادہ اقوامِ عالم کی فلاح و نجات کی فکر رہتی ہو۔ موجودہ سامراجی نظام میں جہاں سرمایہ کا ارتکاز' ذرائع ابلاغ کی پیدا کردہ دھند، ماحولیات کی تباہی، اسلحوں کی دوڑ اور ٹیکس کی

جبری مشین نے فرد کے لیے زندگی جہنّم بنا دیا ہو اور جہاں عام انسان خواہ اس کا تعلق کسی بھی طائفے یا خطّے سے ہو اس صورت حال سے نکلنے کے لیے کسی نجات دہندہ کا منتظر ہو‘ آخری وحی کے حاملین پر لازم ہے کہ وہ تاریخ کے اس نازک لمحے میں انسانوں کی مسیحائی کے لیے سامنے آئیں۔ گویا متّبعین محمدؐ کو صرف اپنی فلاح و نجات کے بجائے دنیا کے چھ بلین انسانوں کو موجودہ نظامِ جبر سے نجات دلانے کا کام بھی انجام دینا ہوگا۔ اور یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب وہ اسلام کے اس پیمبرانہ نظری قالب کا احیاء کر سکیں جو صبغۃ اللہ سے عبارت ہو، کونوا ربّانین کی دعوت سے متصف ہو اور جس پر کسی قومی، لسانی یا تہذیبی احیاء کا شائبہ بھی نہ پایا جاتا ہو۔ جب تک اسلام کے ایک ایسے آفاقی قالب کی تشکیل عمل میں نہیں آتی دیگر اقوام کے لیے متبعیّن محمدؐ کی دعوت پر انبوہ در انبوہ لبیک کہنا ممکن نہ ہوگا۔

قرآن مجید میں کشف کے بجائے سارا زور تدبر و تعقل پر ہے۔قرآن کے نزدیک حقیقی عالم وہی ہے جو ان آیات پر غور کرے کہ آسمان سے بارش کے چند قطرے ایک ہی زمین سے مختلف رنگوں اور اقسام کے پیڑ پودے کیسے اگاتے ہیں؟ اور اس عجیب وغریب انتظام قدرت پر اس کا دل خشیت الٰہی سے معمور ہو جائے۔لیکن اس کے برعکس مسلم معاشروں میں عالم سے وہ لوگ مراد لئے جانے لگے جن کا نظم کائنات میں غور وفکر سے کوئی تعلق نہ تھا اور جو صرف اس حوالے سے عالم کہے جانے لگے تھے کہ انہوں نے اپنے مدارس میں ثانوی اسکول کی ڈگریوں کو عالمیت کا نام دے رکھا تھا۔